© rasailojaraid.com

علم النفسیات کا ایک آفادی پہلو

معرفتِ نفس معرفتِ رب کا کیونکر ذریعہ بنتی ہے

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ کیجئے برہان بابت اگست ۱۹۴۶ء)

از جناب لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب آئی۔ ایم ایس

علم النفسیات کے افادی پہلو کا مقتضا اور منتہا ہی یہ ہے کہ "من عرف نفسہ فقد عرف ربّہٗ" کے فلسفہ کی حقیقت کو پہچانا جائے۔ اسی ایک حقیقت میں انسانی نفسیات کے تمام ظلمت کدے پنہاں ہیں۔ ہم اس مقالے میں اسی حقیقت سے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ جس نے اس حقیقت کا شعور پیدا کرلیا، اس نے اپنے تمام حجابات سے یک قلم پردہ اٹھا دیا۔ ہم نے آئندہ صفحات میں جابجا (Complexes.) کے لئے حجابات کا لفظ استعمال کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس لفظ کو اردو زبان میں کسی اور لفظ سے زیادہ موزوں سمجھتے ہیں کیونکہ Complexes. انسان کے اندر ایک Inhibition. یعنی حجاب پیدا کردیتے ہیں اس لئے حجاب ہی ہوا۔ سرکاوٹ یا الجھاؤ ذہنی انتشار ظاہر کرتے ہیں اور یہ علامتیں Complex کی بنا پر بہت بعد میں پیدا ہوتی ہیں۔ انسان کی زندگی کا دارومدار انہی حجابات کے سمجھنے پر ہے تاکہ اس کے قلب و ذہن پر جو مُہر ثبت ہوتی ہے وہ دور ہو جائے۔ یہ تمام حجابات انسان کے ماحول کے مطابق پیدا ہوتے ہیں اور ہم ان کا ذکر پچھلے مقالے میں کر آئے ہیں۔ یہی وہ مشکل مقام ہے جس میں انسان گھرا ہوا ہے۔ ولقد خلقنا الانسان فی کبد۔

انہی حجابات کی وجہ سے مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بہت کم رہ جاتا ہے اور وہ رابطہ قائم نہیں کرسکتا چنانچہ قرآن مجید کی آیت خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ الآیہ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انھیں حجابات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان تمام حجابات اور نقائص کا سرچشمہ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں علم النفسیات کی اصطلاح کے مطابق وہی احساس کمتری ہے جس کے باعث انسان خود اپنے آپ کو اور اپنی حقیقت کو نہیں پہچان سکتا اور جب اپنے آپ کو نہیں پہچانتا تو پھر خدا کو بھی نہیں پہچانتا۔

یہ شعور پہلے بھی تھا — اول ہم مختصر طور پر اسی حقیقت کے شعور کی تاریخ لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی دنیا میں یہ شعور بہت قدیم ہے چنانچہ میناکس (Mencius.) اعلان کرتا ہے۔

"Who Knows his own nature Knows Heaven."

یعنی جو اپنی فطرت سے آگاہ ہے وہ اپنے خدا کو جانتا ہے۔

غور کیجئے وہ کیا بات تھی جس نے مینکیس کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرائے۔ پھر اس سے کئی صدیاں بعد ہم دیکھتے ہیں کہ سینٹ آگسٹائن (St. Augustine.) بھی اس حقیقت کا معترف ہے اس کا مشہور اعتراف دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"I, Lord, went wandering like a strayed sheep, seeking thee with anxious reasoning without, whilst thou wast within me .... I went round the Street and squares of the City of this world Seeking thee, And I found thee not because invain I sought without for Him who was within myself.

یعنی میں، اے میرا خدا، ایک گمشدہ بھیڑ کی طرح اپنے سے دور تیری تلاش و جستجو میں بصد دلائل آوارہ گردی کرتا رہا حالانکہ تو خود میرے اندر موجود تھا ..... میں نے اس دنیا کے شہر کی تمام گلی کوچوں میں تجھے ڈھونڈا، مگر تو نہ ملا۔ میں نے ناحق تیری تلاش اپنے گرد و نواح میں کی جبکہ تو ہمہ وقت میرے اندر ہی موجود تھا۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عارف رومی اور اقبال

یہی وہ حجاب تھا کہ جب عارف رومی کی روح اپنے اولین منازل پر اپنے خالق کی متلاشی تھی تو بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا " خدایا! ایں چہ بوالعجبیست کہ باد و تا لی خودمی کنی؟ وقتیکہ کہ ترا می جوئیم خود را می یابیم۔ ووقتیکہ خود را می جوئیم ترا می یابیم!"

علامہ اقبال مرحوم بھی یہی طلسم توڑنے کے درپے تھے اور انھیں بھی اپنی خودی کی تعلیم اس کے بغیر ناممکن نظر آتی تھی جب تک کہ وہ یہ حجاب نہ دور کرلیں، احساسِ کمتری کا طلسم تو انھوں نے بھانپ لیا تھا مگر اس طلسم کو وہ بھی اس طرح توڑ سکتے تھے کہ اس حجاب کو آشکارا کردیں۔ چنانچہ اسرارِ خودی میں فرماتے ہیں۔

تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی　　　تلاشِ خود کنی جز او نہ یابی

اور یہی وہ مقام تھا جہاں پہنچکر سرمد کی آنکھیں بھی حق الیقین سے چکاچوند ہوگئی تھیں اور وہ پکار اٹھا تھا۔

بیہودہ چرا درپے او می گردی　　　سرمد اگر او خداست خود می آید

" چرا درپے او می گردی" کے اندر ایک شعور اور اعتراف موجود ہے جس کی وضاحت سینٹ آگسٹائن والے بیان سے بخوبی ہوگئی ہے اور " خود می آید" کے اندر ایک حقیقت پنہاں ہے کہ وہ یہیں ہے باہر اور کہیں نہیں اور یہاں ہی ملے گا۔

تو گویا یہ احساسات جو ہم نے اوپر درج کئے ہیں ان سب میں ایک ہی حقیقت جاری و ساری نظر آتی ہے۔ عبارا تنا شتّی وحسنک واحد۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر اس حجاب کا شعور کیوں اس قدر مستور ہے؟ اس کی محض ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ جب انسان نے اپنے رب تک پہنچنے میں دقت محسوس کی تو کچھ تو اس میدان کو ہی چھوڑ بھاگے اور کچھ جن میں صبر و تحمل تھا وہ اور آگے بڑھے اور انھوں نے اپنے حجابوں کو پالیا۔ اور انھوں نے یہ تمام طلسم توڑ ڈالے۔ جدید علم النفسیات کی اصطلاح میں گویا انھوں نے تحلیلِ نفسی کا عمل خود اپنے اوپر آزمایا اور وہ کامیاب ہوئے۔ انھوں نے اپنے حجابات اور الجھنوں کو دور کرلیا اور زندگی کا مقصد اور مدعا پالیا۔ یہ لوگ معدودے چند تھے چونکہ یہ علم مخصوص تھا اور یہی وہ لوگ تھے جنھیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم صوفیائے کرام کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں جدید تعلیم نے علم النفسیات کو عام کر دیا ہے اور ہر ایک اس سے مستفیذ ہو سکتا ہے۔ پہلے جو افکار و خیالات صوفیائے کرام کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے تھے اب ان کا مذاق عام ہو رہا ہے اور لوگوں میں خدا کی وحدانیت و یکتائی کا علم و یقین بڑھ رہا ہے۔ اس بنا پر شرک کی نوعیت بھی بدل گئی ہے۔ عنقریب یہ حجاب دنیا سے بالکل ناپید ہو جائے گا اور دنیا دیکھ لیگی کہ "یاران دیگرے رامی پرستند"

اب ہم جدید نفسیاتی رنگ میں اس امر کی تفصیل کرنا چاہتے ہیں کہ فقد عرف ربہ کی تکمیل من عرف نفسہ پر کس طرح مبنی ہے اور صوفیائے کرام اس حقیقت سے کس طرح فائدہ اٹھاتے تھے اور ان میں مجذوبوں کا فرقہ کس طرح پیدا ہوتا تھا۔ ہمارے نزدیک صوفیائے کرام کا طریقہ کار اس افادی پہلو کے سمجھنے کے لئے زیادہ مناسب ہے۔

ذہنی ترکیب کے تین حصے | ڈاکٹر فرائڈ (Sigmund Freud) کا نظریہ ذہنی ترکیب کے تین حصے کرتا ہے جسے ہم ایک دائرے کی شکل میں یوں بآسانی واضح کرسکتے ہیں۔

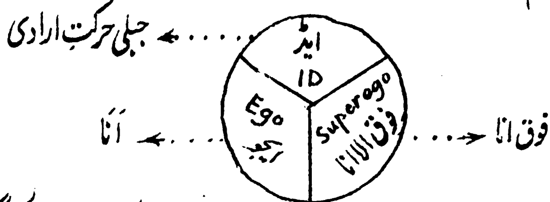

سب سے پہلے ہم نفس کے اس مشہور و معروف حصہ سے بحث کرتے ہیں جس کو انگریزی میں Ego. یا انا کہا جاتا ہے۔ دوسرے حصہ کو ڈاکٹر فرائڈ نے ID (ایڈ) کہا ہے یعنی وہ حصہ جو فرد کی جبلی حرکتِ ارادی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور تیسرے کو Super Ego یا فوق انا کہتے ہیں۔ ان تمام کا باہمی تعلق وہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ایجو، فطرت اصلی کے متعلق اطلاعات بہم پہنچاتی ہے۔ ایڈ یعنی جبلی حرکتِ ارادی کو وہ ایک حس تصور کرتے ہیں جس سے عام خواہشاتِ انسانی پیدا ہوتی ہیں اور سب سے آخر میں وہ فوق انا کو انسانی اخلاق کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں کہ وہ اس کی تربیت کی ذمہ دار ہے اور اس کی روحانی رہنمائی کرتی ہے۔ چنانچہ حرکت علم النفسیات میں خواہش کی شکل بھی اختیار کرسکتی ہے اور حرکت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بمعنی سیرت بھی ہوسکتی ہے۔ ہر حالت میں حرکت ہی زندگی کی ایک علامت ہے۔ مختصر یہ کہ حرکت زندگی ہے یہ حرکت اول ایڈ یعنی فرد کی جبلی قوتِ ارادی میں پیدا ہوتی ہے کیونکہ خواہشات کا تمام سرمایہ اسی جگہ ہوتا ہے اور یہیں سے ایجو یا انا کے توسط سے وہ فوق انا تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ گویا اوّل حرکت ارادی انا سے واقفیت حاصل کرتی ہے یعنی من عرف نفسہٗ اور بعد ازاں وہ فوق انا کو پہچانتی ہے یعنی فقد عرف ربّہ۔

ڈاکٹر فرائڈ کے نزدیک یہ طریقہ کار ذہنی بندوبست کا معمول ہے اور اگر اس میں ذرا سا ترتیب کا فرق پڑ جائے تو ذہنی توام و ترتیب میں انتشار پیدا ہوجاتا ہے۔ مثلاً اگر یہی سلسلۂ حرکت بجائے مندرجہ بالا راہ اختیار کرنے کے ایجو یا انا کا توسط رد کردے اور براہ راست ایڈ یا جبلی حرکت ارادی Super Ego یعنی فوق انا کے دروازے پر دستک دے تو نتیجہ لازماً ذہنی انتشار ہوگا۔ "راہ راست برو گرچہ دور است" زبان زدِ عام ہے۔ مگر اس سے بڑھ کر حقیقت یہاں اور کوئی نہیں ہوسکتی۔

مجذوب ہونے کی حقیقت اور اس کی وجہ

روحانی دنیا میں ہمیں اس قسم کی اکثر مثالیں ملتی ہیں، سب سے بڑی مثال صوفیوں کے درمیان مجذوبوں کی ہے۔ مجذوب وہ صوفی ہیں جو راہِ راست پر نہیں۔ وہ ایڈ یعنی جبلی حرکتِ ارادی سے کود کر سیدھے فوق انا تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں گویا وہ "راہِ راست" اختیار نہیں کرتے اور اپنے مقصد میں ایک Short Cut یعنی چھوٹا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تاکہ اپنے مقصد پر جلد پہنچ جائیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی انا یا خودی پر تو حجاب رہتا ہے مگر وہ فوق انا پر ہاتھ بڑھا دیتے ہیں۔ اس بنا پر ذہنی انتشار پیدا ہوتا ہے اور ان کی عقل اور ان کا ادراک سلب کرلیا جاتا ہے یا یوں کہئے ہوجاتا ہے۔ مجذوب توسطِ انا کا سلسلہ چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا من عرف نفسہٗ کے قائل نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے ہیں تو فقد عرف ربّہٗ کے!! وہ سرے سے خدا کو پکڑنا چاہتے ہیں بالآخر وہ مجذوبانہ افعال کے مرتکب ہونے لگتے ہیں۔ اس کی محض وجہ یہ ہوتی ہے کہ ایڈ یعنی جبلی حرکت ارادی انا کی طرف بوجوہ حجاب نہیں بڑھتی، حجاب احساس کمتری کا ہوتا ہے اس سے ان کی خودی آشکارا نہیں ہوتی اور وہ حرکتِ ارادی براہِ راست فوق انا کی طرف بڑھتی ہے۔ اس Short Cut یعنی مختصر راہ کی وجہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی کے گذشتہ ناموافق اثرات ہوتے ہیں۔ ایگو یعنی انا بیدار نہیں ہوتی اور وہ یہ بار برداشت نہیں کرسکتی اور وہ حرکات یا ارادات جو ایڈ پیدا کرتی ہے، پورے نہ ہونے کی وجہ سے ذہنی الجھاؤ پیدا کرتی ہیں۔ یعنی خرد کا ذہنی توازن نہ تو قائم رہتا ہے اور نہ ہی برقرار رہتا ہے اور وہ اس حجاب کی وجہ سے اپنے مقصد سے بہت دور بھٹک جاتا ہے۔ اگر یہی حرکت جبلی انا کی طرف بڑھ کر اسی میں قیام کرجائے اور مقصد حاصل کرنے کے باوجود آگے فوق انا کی طرف نہ بڑھے تو اس قیام کا نتیجہ بھی برعکس ہوتا ہے یعنی منزل مقصود تک تو پہنچ جاتا ہے مگر عجیب ڈھنگ سے۔ خرد کی انا مستحکم ہوتی جاتی ہے اور اس کا اعتماد اس پر اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ وہ فوق انا کو بھی بسا اوقات نظر انداز کردیتا ہے جو اس کا دراصل منتہائے نظر ہوتا ہے پیش از وقت اس کے حجابات دور ہونے لگتے ہیں۔ اور اس کی خودی ایک آن میں آشکارا ہو جاتی ہے مگر وہ آگے بڑھنے میں دقت محسوس کرتی ہے، اسے اپنی ہی خودی سے محبت و عشق ہو جاتا ہے۔ اس حالت کو جدید نفسیات میں (Narcissism.) یعنی خود پرستی کہتے ہیں۔ یعنی انسان خود اپنے آپ کو اپنا محبوب تصور کرتا ہے اور انا الحق کا نعرہ اس کی زبان سے بے اختیار نکل جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام کے اِن عقائد و افعال کی جو عوام کو بدظن کردیتے ہیں حالانکہ اس میں نفسیاتی و روحانی نقطۂ نگاہ سے کچھ غلطی نہیں ہوتی۔ بات صرف اتنی تھی کہ عوام اس بات کے اہل نہ تھے کہ وہ اس دقیق نکتہ کو سمجھتے۔ ان کا مذاق پست تھا اور مطالعہ کم مشاہدہ غیر معلوم اور ناپید تھا۔ درحقیقت مجذوب اپنے افعال کے ذمہ دار نہیں ہوتے، ان کی عقل ان سے سلب ہو چکی ہوتی ہے اس لئے وہ معذور ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی بات نہیں کہ وہ روحانیات میں کچھ کم درجہ رکھتے ہیں، ان کا مقام بدستور قائم رہتا ہے البتہ جہاں تک ان کا تعلق مادی دنیا سے ہوتا ہے وہ اس سے رابطہ نہیں رکھتے۔ اگرچہ یہ حالت خود پیدا کردہ ہوتی ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ ایسی حالت میں افعال کا جائزہ نہیں لیتے۔ یہ ہے مختصر طور پر تفصیل اُن ذہنی انتشارات کی جو روحانیات میں مداخلت کرتے ہیں اور جنھیں ہم نے یہاں Complexes. یعنی حجابات کی وضاحت کے لئے بیان کردینا ضروری سمجھا۔

ہم روزمرہ اسی قسم کے اور بھی واقعات رکھتے ہیں جنھیں ہم دماغی خلل کہتے ہیں اور جو مجذوبیت سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت متفاوت ہیں۔ خلل اور انتشار کی نوعیت بہت ملتی جلتی ہے اور عوام کے لئے ایک پاگل اور ایک مجذوب میں امتیاز کرنا بڑا مشکل ہے مگر ان دونوں کا آپس میں دور کا بھی تعلق نہیں۔ پاگل میں جو حجاب ہوتا ہے وہ مادی ہوتا ہے اور مجذوب کا حجاب روحانی ہوتا ہے۔ ہمارے موضوع کا تعلق مادی حجابات یعنی Material Complexes. جو ہمارے ماحول کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اُن سے ہے، اور اب ہم ان سے متعلق کچھ عرض کریں گے۔ روحانی حجابات کا ذکر ہم نے اس لئے کر دیا ہے کہ سمجھنے میں آسانی رہے اور ڈاکٹر فرائڈ کے نظریے کے مطابق اس کی تطبیق ہو جائے۔

ذہنی ترکیب سے متعلق فرائڈ کا نظریہ کوئی انوکھا نہیں ہے۔ قارئین کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائڈ سے صدیوں پہلے انسان اور اس کے عوارض کو اس طرح کے ایک نقشہ سے سمجھایا ہے۔ چنانچہ حدیث ہے۔

عن عبداللہ رضی اللہ عنہ قال خط النبی صلی اللہ علیہ وسلم خطاً مربعاً وخط خطاً فی الوسط خارجاً منہ وخط خططاً صغاراً الی ھذا الذی فی الوسط من جانبہ الذی فی الوسط وقال ھذا الانسان وھذا اجلہ محیط بہ وھذا الذی ھو خارج املہ وھذہ الخطط الصغار الاعراض فان اخطاہ ھذا نھسہ ھذا وان اخطاہ ھذا نھسہ رواہ البخاری (مشکوٰۃ باب الامل والحرص)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مربع خط کھینچا اور اس کے درمیان میں ایک باہر نکلا ہوا خط کھینچا اور اس خط پر دونوں طرف نکلے ہوئے چھوٹے چھوٹے خط بنائے اور فرمایا یہ درمیانی خط انسان ہے اور یہ مربع خط اس کی اجل ہے جو اس کو گھیرے ہوئے ہے یا جس نے اس کو گھیر لیا ہے اور یہ خط جو باہر نکلا ہوا ہے یہ اس کی امید ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے خط آفات اور اعراض ہیں اگر اس سے بچا تو اس میں پھنس گیا اور جو اس سے بچا تو اس میں مبتلا ہو گیا۔"

نقشہ

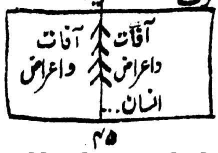

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب اس نقشے کو ذرا نظرِ تعمق سے ملاحظہ فرمائیے۔ ظاہری ساخت میں اختلاف ہے ہم نے ڈاکٹر فرائڈ کے نظریہ کو بیان کرنے کے لئے ایک گول دائرہ بنایا مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مطابق آپ نے ایک مربع خط کھینچا۔ ہم بجائے دائرے کے ایک تکونا یا مستطیل بھی بنا سکتے تھے۔ ہر حالت میں ظاہری ساخت ایک خول کا کام دیتا۔ آپ تصور کر لیجئے کہ دائرہ اور مربع دونوں خط اجل ہیں حدیث میں مربع کے درمیان انسان ہے وہاں دائرے کے درمیان نفسِ انسانی کی ترکیب ہے، یا یوں کہہ لیجئے روح ہے۔ حدیث میں انسان امید اور آفات کے درمیان گھرا ہوا ہے جو اس کی خواہشات ہیں۔ فرائڈ ان کو ایڈ یا فرد کی جبلی حرکتِ ارادی سے تشبیہ دیتا ہے اور یہ جو ایگو یا انا ہے اُسے ہم امید کے مترادف سمجھتے ہیں۔ کیونکہ انا ہی امید کی بانی ہوتی ہے۔ اگر انا نہیں تو امید بھی مفقود ہے۔ اجل فوق انا ہے اور یہی اس کا منتہائے آرزو ہے یعنی فنا، اور یہی اس کا مقصد ہے یعنی ایک حقیقتِ بالا میں جذب ہو جانا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اگر انسان آفات و اعراض یعنی ایڈ سے بچا تو امید یعنی انا میں پھنس گیا اور اگر انا سے بچا تو ایڈ یعنی آفات و اعراض میں پھنس گیا۔ ہر حالت میں اعتدال لازم ہے اور یہی صراطِ مستقیم ہے کہ ان کے مابین راہ اختیار کی جائے تاکہ ذہنی توازن قائم رہے اور انسان احسن تقویم کا مصداق بنا رہے۔

مادی حجابات اب ہم مادی حجابات (Material Complexes.) کی طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ ہمارا اصل موضوع یہی ہے۔ ہم نے بار بار اس بات کی تفصیل کی ہے کہ حجابات احساسِ کمتری کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ احساس انسانی زندگی کے کسی بھی شعبہ سے اثر پذیر ہو سکتا ہے۔ دماغی و جسمانی، مالی و معاشرتی کمزوریاں اس کی بانی ہوتی ہیں۔ جب یہ پہلو انسانی زندگی پر اثر ڈالتے ہیں تو غیر شعوری طور پر وہ انسان کے شعور میں آ کر حرکت پیدا کرتے ہیں۔ انسان کی زندگی کو وہ اپنی قوت اور کھنچاؤ کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ انسان اکثر حالات میں نہ تو اس بات کو محسوس کرتا ہے اور نہ ہی اقرار کرتا ہے۔ جس طرح حافظہ میں کوئی بات جا کر محفوظ رہتی ہے اسی طرح یہ اثرات وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ ان اثرات کا طریقِ کار بہت تفصیل چاہتا ہے۔ یہاں مختصر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طور پر ایک مثال سے اسے واضح کردینا نامناسب نہ ہوگا

فرض کیجئے ایک شخص ہر روز بائیسکل پر سوار ہوکر اپنے دفتر یا کام کاج پر جاتا ہے۔ اول دو تین روز اسے راستہ تلاش کرنے میں دقت ہوگی، مگر بعد ازاں وہ خود بخود بائیسکل پر سوار ہوکر اپنے کام پر پہنچ جائے گا۔ راستے میں وہ ہرگز یہ کہتا ہوا نہیں جاتا کہ میں وہاں جارہا ہوں اور وہاں جارہا ہوں بلکہ خود بخود وہ منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے آخر یہ کیوں ایسا ہوتا ہے۔ کونسی وہ طاقت ہے جو اُسے وہاں لے جاتی ہے وہ محض بائیسکل پر سوار ہوتے وقت دل میں کہتا ہے کہ اب مجھے دفتر چلنا چاہیئے پھر وہ سگرٹ سلگا کر اپنے خیالات میں مگن چلا جاتا ہے تاوقتیکہ وہ مقام پر پہنچ محسوس کرتا ہے کہ اب وہ منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہے اور اسے بائیسکل پر سے اتر جانا چاہیئے۔ راستہ میں وہ ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں سوچتا کہ اسے کہاں جانا ہے۔

غیر شعوری اثرات | یہ ہے نتیجہ ان اثرات و تجربات کا جو غیر شعوری حصہ میں محفوظ رہتے ہیں اور یہ ہے طریقہ جس سے وہ غیر شعوری طور پر شعور میں آکر کام کرتے ہیں کہ انسان انھیں محسوس تک نہیں کرتا اور وہ بغیر ظاہری سعی و کوشش کے حرکات پیدا کرلیتا ہے۔ جس قدر پختگی سے یہ تجربات یا اثرات قائم ہوں گے، اسی قدر تیزی اور سرعت سے شعور پر اثر پذیر ہونگے اور ان سے افعال سرزد ہوں گے۔ زندگی کے واقعات وحادثات کا یہی ایک خزانہ ہے جہاں تجربات محفوظ رہتے ہیں اور بوقتِ ضرورت یہ غیر شعوری طور پر کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وہ قوت ہے جسے قوتِ ارادہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہماری زبان میں اختیار اور ارادہ بے معنی لفظ ہیں۔ اختیار اور ارادہ اللہ ہی کے لئے ہیں۔ انسان کو ان کا بہت قلیل حصہ دیا گیا ہے جو چیز اللہ تعالیٰ نے انسان کو بخشی ہے وہ محض یہ ہے کہ وہ نیک و بد میں تمیز کرسکے اور اپنی راہ تجویز کرسکے راہ کا اختیار کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اگر اس کی خواہشات میں قوت ہے تو وہ دیکھے گا کہ ایک ایک کرکے وہ تمام پوری ہوتی رہتی ہیں۔

ہمارا یہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ یہ عجیب بات ہے جو کچھ سوچو ویسے ہی ہوجاتا ہے یا بعض کہتے ہیں کہ جو کچھ کبھی اللہ سے مانگا ہے اس نے دیا ہے یہ بات لازمی ہے کہ جب کبھی بھی انسان کچھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خواہش کرتا ہے تو وہ ضرور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگتا ہے۔ چنانچہ خواہش کرنا اور اللہ تعالیٰ سے اس کے لئے مدد مانگنا ایک ہی چیز ہے اور یہ بھی واقعی امر ہے کہ وہ پوری ہوتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ کس طرح ہوتا ہے کیا وہ لوگ جو یہ بات کہتے ہیں ارادہ نہیں رکھتے؟ آخر وہ بھی تو مدعی ہیں اس بات کے کہ جو کچھ سوچتے ہیں وہ ہو جاتا ہے۔ ان کا ارادہ تو پھر بہت زبردست ہوگا، اگر وہ یہ دعوےٰ کردیں کہ ہم یوں کردیں گے اور وہ کردیں گے؟ یہ بات نہیں ہے۔ انسان کا ارادہ کچھ چیز نہیں اور نہ ہی اس کا اختیار۔ یہ اصطلاحات ہماری زبان میں محض شاعرانہ حسنِ ظن ہے۔ اختیار اور ارادہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔ انسان کو جو اختیار دیا گیا ہے وہ محض سوچ بچار کا ہے کہ وہ نیک و بد میں تمیز کر سکے اور پھر اس اختیار میں اس کا کچھ اختیار نہیں، کیونکہ وہ اپنے ماحول کے مطابق سوچتا ہے جیسا ماحول ہوا ویسے ہی خیالات پیدا ہوئے اور اگر یہ کہا جائے کہ ہم ماحول اپنے خیالات کے مطابق پیدا کر سکتے ہیں تو یہ قطعی طور پر غلط ہے۔ اگر آپ کر سکتے ہوں گے تو وہ محض یہاں تک ہی محدود ہوگا کہ آپ اپنے کمرے یا مکان کا رنگ و روپ اور فرنیچر ملا جلا کر اپنی طبعیت کے مطابق کرلیں مگر اس کو ماحول کی مطابقت نہ کہا جائے گا۔ رہ گئی خواہشات کی قوت تو اس سے ہماری یہ مراد ہے کہ آپ کو ایک چیز پسند ہے تو اب یا تو بہت ہی پسند ہوگی یا بہت پسند ہوگی اور یا فقط پسند ہوگی اس طرح اس خواہش کے تین درجے ہیں اور یہی اس خواہش کی قوت کی بنا ہوگی۔ اسی طرح جب آپ کو ایک بات کا یقین ہوگا تو اس کے بھی تین ہی درجے ہوں گے یا تو بہت ہی یقین ہوگا یا بہت یقین ہوگا اور یا پھر محض یقین ہوگا۔

پس انسان نیک و بد میں تمیز کرکے ایک آرزو باندھتا ہے تو اس کی قوت اس کی مانگ کے مطابق ہوتی ہے اور وہ فوراً شعور میں آتی ہے اور پھر وہاں سے ذہن کے غیر شعوری حصہ میں چلی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ صرف شعور کی سطح پر اسی وقت آتی ہے جب انسان اس کے متعلق سوچتا ہو ورنہ پھر اس کے شعور میں نہیں ہوتی۔ اور او جھل رہتے ہوئے وہ غیر شعوری طور پر اپنا کام کرتی رہتی ہے یعنی ایک حقیقی شکل اختیار کرتی رہتی ہے جس طرح ہم نے ابھی بائیسکل والی مثال سے واضح کیا ہے یہ شعور کا ایک غیر شعوری فعل ہے۔ ایک بات کے متعلق متعدد بار سوچنا اس بات کی دلیل نہیں کہ باتیں مختلف ہیں بلکہ یہ تکرار محض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقویت کی بنا پر ہے اور اس سے تعدد مقاصد لازم نہیں آتا۔ یہ تمام خواہشات اور آرزوئیں محفوظ رہتی ہیں اور خاموشی سے اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ ان فرائض سے اگو یعنی انا بیدار ہوتی، وہ بار بار اس کی طرف توجہ دیتی رہتی ہے اور اپنے فرائض کو نہیں بھولتی۔ اور وہ خواہش پوری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ ہے انسان کا ارادہ اور اس کا اختیار۔

مختصر طور پر انسان کے اختیار میں جو بات ہے وہ محض اتنی ہی ہے کہ وہ اپنی بہتری کو شناخت کر سکے اور اس کے متعلق ایک پختہ خیال جما سکے اور اسے بار بار یاد کرے تو پھر یہ خیال شعور میں آ کر غیر شعوری طور پر مکمل ہونا شروع ہوتا ہے تاوقتیکہ انسان اپنا مدعا نہ پالے۔ یہی طاقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو بخشی ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ جبر و اختیار بھی اسی غیر شعوری ذہن میں پنہاں ہیں۔ اسے اگرچہ انسان نہیں جانتا اللہ تعالیٰ ضرور جانتا ہے کیونکہ "وہ محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا ہے"۔ انسان کو اختیار محض ایک خواہش کی شکل قائم کرنے کا ملا ہے اس کو حقیقت کا جامہ پہنانا اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ نیک و بد کی تمیز کر سکتا ہے مگر اپنے مفاد کے لئے کسی ایک کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ یہ اس کے اختیار کی بات نہیں۔ کیونکہ وہ تمام تاثرات اور تشخیصیں اس کے غیر شعوری ذہن میں جا کر اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے علم کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ انسان ان پر قادر نہیں ہوتا۔ وہ خود بخود قانونِ بالا کے مطابق عمل میں آتی رہتی ہیں اور انسان کی زندگی ڈھالتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات انسان ان پر قابو پا سکتا ہے اور اپنی تقدیر کو بدل سکتا ہے۔ اپنے ماحول کے پیدا کردہ تجربات اور اثرات کو سمجھ کر انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ انھیں مناسب طور پر ڈھال کر استعمال کرے وہ یقیناً اپنی زندگی کو بدل سکتا ہے مگر ان اثرات کے خلاف نہیں، اگر انسان کی زندگی ایک ایسے سانچے میں ڈھل جائے جس کے اثرات اس کے ذہن میں موجود نہ تھے تو یہ انسان کے لئے ایک بعید از عقل کام ہے۔ ایسا کام اللہ تعالیٰ ہی کا ہو سکتا ہے انسان فقط اس طرح اپنی تقدیر بدل سکتا ہے کہ وہ ان اثرات کو سمجھے اور جہاں جہاں بُرے اثرات ہوں ان پر قابو پائے اور انھیں ظاہر ہونے سے روکے۔ مختصراً جدید نفسیاتی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ انسان اپنے Complexes کو سمجھ کر اپنے اوپر Psychoanalysis. یعنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تحلیل نفسی کا عمل کرے اور اپنا علاج کرے اور بس! لیکن یہ آسان بات نہیں ہے اور نہ ہر شخص اس کا اہل ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ مشہور شعر اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

اس شعر کا نفسیاتی پہلو وہی ہے جس کی ہم نے ابھی تفصیل کر دی ہے یعنی انسان اپنی اَنا کو اس قدر پختہ کرے کہ تمام حجابات اٹھ جائیں تب وہ اس قابل ہو جائے گا کہ اپنی زندگی کے حجابات کو مفید کام میں لگا سکے گا۔

تو گویا گذشتہ صفحات کا لب لباب یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو سمجھے تاکہ اپنے رب کو سمجھ سکے اور جب وہ دونوں کو سمجھ گیا تو دونوں کا منظورِ نظر بن گیا پھر جو چاہے کر ڈالے۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو سمجھے اور دھوکہ نہ دے۔ یقیناً نہ تو وہ کسی اور کو دھوکہ دے سکتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو جو محسوسات اور غیر محسوسات کا جاننے والا ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو دھوکہ نہ دے تو اس میں اسی کی بہتری ہے۔ کیونکہ اس سے اس کے تمام حجابات دور ہو جائیں گے۔ انسان کو چھوڑ کر اقوام کا سیاسی اقتدار اور ان کی معاشرتی مدوجزر انہی حجابات پر منحصر ہے اور یہی وہ مشکلات ہیں جنھیں وہ قدم قدم پر مسکراتے دیکھتا ہے اور ٹھٹھر جاتا ہے۔

خاندانی اثرات اب ہم انہی مادی حجابات کا ایک اور نفسیاتی پہلو لیتے ہیں۔ گذشتہ مقالے میں ہم نے خاندانی اثرات کا ذکر کیا تھا۔ بچپن میں جو اثرات انسان کے ذہن میں گھر کے ماحول کی وجہ سے پڑتے ہیں اس کے مطابق بچے کی آئندہ زندگی نشو و نما پاتی ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی ہے ان اثرات میں بھی بدستور ترمیم ہوتی رہتی ہے۔ یعنی ان کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً اگر بچپن میں مار پڑتی ہے تو جب بچہ بڑا ہوتا ہے تو یہ بند کر دی جاتی ہے اور دھمکیاں دی جاتی ہیں پھر محض تنبیہ پر اکتفا کر لیا جاتا ہے گویا یہ اثرات یا تجربات ہیں ایک ہی قسم کے مگر ان کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اب جب بچہ جوان ہوتا ہے انھیں اثرات کے زیرِ اثر تو وہ انہی کے مطابق عمل کرتا ہے اور اب اس کے اعمال کا اثر اس کے گرد و نواح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے تو پھر اس کا گرد و پیش انہی نئے اثرات کے مطابق عمل کرتا ہے۔

مثال کے طور پر بیٹے کی شادی بڑی چاہت سے والدین کرتے ہیں مگر جونہی دلہن گھر میں قدم رکھتی ہے ساس بہو کے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان جھگڑوں کا باعث نفسیاتی ہے اور ان کی تحلیل کی جا سکتی ہے جو بہت تفصیل چاہتی ہے۔ ہم انشاء اللہ پھر کسی صحبت میں قارئینِ کرام کے سامنے یہ چیز پیش کریں گے اور ان کی وجوہات بیان کر کے اس کا علاج بھی انشاء اللہ تعالیٰ درج کریں گے تاکہ خاندانی معاملات میں یہ چیز کارآمد ثابت ہو اور اس کا افادی پہلو عملی طور پر ثابت ہو جائے۔

غصہ کی نفسیاتی وجہ

اسی طرح ہم نے گذشتہ مقالے میں ایک مقام پر انسانی جذبات کا بھی ذکر کیا تھا جس میں غصہ قابلِ ذکر ہے۔ اب ہم آئندہ صفحات میں جماعت یا سوسائٹی کی نفسیاتی تحلیل کرنا چاہتے ہیں تاکہ جو جو نقائص جن جن وجوہات کے باعث پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کر کے نفسیات کا افادی پہلو ثابت کر دیا جائے۔ ہم جہاں جہاں جماعت کا ذکر کریں گے اس سے مراد مسلمانوں کی ہی جماعت ہوگی کیونکہ آج کل ہمیں سب سے دگرگوں حالت یہیں نظر آتی ہے۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ غصہ (Anger.) احساس کمتری کی علامت ہے۔ دلیر انسان غصہ میں نہیں آتا کیونکہ اسے اپنے حوصلہ اور مردانگی کا یقین ہوتا ہے۔ غصہ وہی شخص کرتا ہے جو کمزور اور ناتواں ہو اور وہ اپنی طاقت پر اعتماد نہ رکھتا ہو۔ یہاں طاقت سے جسمانی اور دماغی دونوں طاقتیں مراد ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ جہاں لڑائی جھگڑا ہو گا وہاں بزدل انسانوں کا ایک انبوہ نظر آئے گا۔ اس میں دلیر انسان ہرگز شامل نہیں ہوں گے۔ اگر ہوں گے تو صلح کروانے والوں میں ہوں گے۔ علمی مناظروں میں ہمیشہ جن کا علم کوتاہ ہے وہی جھگڑتے ہیں۔ صاحب علم اور دانا کا یہ شیوہ ہے کہ بحث و مناظرہ میں خاموشی اختیار کریں گے۔ گویا علمی جھگڑوں میں بھی اکثریت جاہلوں کی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ایک حدیث بیان کر دینا نامناسب نہ ہو گا کیونکہ یہ نفسیات کے افادی پہلو کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور وہ ہی ہمارا موضوع ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ
صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس الشدید	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زبردست وہ
بالصرعتا نما الشدید الذی	نہیں ہے جو اپنے مقابل کو شکست دے بلکہ زبردست
یملک نفسہ عند الغضب	وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس کو قبضے میں رکھے

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہو گئیں ایک یہ کہ شکست دینے والا زبردست نہیں ہوتا اور دوسرے زبردست وہ نہیں ہے جو غصہ میں آجائے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ احادیثِ نبوی علم النفسیات کے حقائق سے پُر ہیں اور ان کا افادی پہلو ثابت ہے۔ اب ہم جدید علم النفسیات کی رو سے اس حدیث کی تفصیل کریں گے اور ثابت کریں گے کہ غصہ اور دیگر جذباتی اظہار جماعت کے لئے کس طرح زہر قاتل ثابت ہوتے ہیں اور ان میں کس طرح احساسِ کمتری کام کرتا رہتا ہے عوام سمجھتے ہیں کہ یہ احساس برتری ہے یعنی Superiority Complex ...

ماہرینِ علم النفسیات نے اس ضمن میں ایک باب باندھا ہے جسے وہ Mental Protest یا Transference of Emotion کہتے ہیں۔ ہماری زبان میں انھیں ذہنی احتجاج یا نقلِ جوش کہا جا سکتا ہے اس کی مختلف وجوہات بیان کی جاتی ہیں۔ چونکہ غصہ (Anger) نقلِ جذبات ہے اس لئے ہم ان وجوہات کو اپنے انداز میں یہاں درج کرتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

غصہ کی بھی سب سے پہلی وجہ احساسِ کمتری ہے جو مسلسل کھٹکتا رہتا ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم وجہ یہ ہے کہ کوئی ایسا حادثہ یا واقعہ پیش آجائے جہاں انسان کسی ڈر کی وجہ سے اظہار نہ کر سکے تو یہ جذبات یا کیفیت منتقل ہو کر کسی دوسری جگہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر اپنے سے طاقتور سے جھگڑا ہو گیا ہو اور اس نے پچھاڑ دیا ہو تو کسی کمزور پر یہ غصہ نکل جائے گا۔ ضروری نہیں کہ یہ طاقت جسمانی ہی ہو۔ دماغی بھی ہو سکتی ہے اور بعض دفعہ تو دماغی شکست جسمانی شکل میں منتقل ہو جاتی ہے۔

اکثر سننے میں آتا ہے کہ جب ماسٹر گھر میں بیوی سے لڑ کر آیا ہو تو سکول میں لڑکوں کو پیٹتا ہے ہمارے نزدیک یہ خیال درست ہے اور ایک حقیقت ہے بچوں کو مار پڑھائی کی وجہ سے بہت کم پڑتی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استاد اگر مارے تو اس کی دو وجوہات ہوتی ہیں۔ اول یہ جو ہم نے بیان کی ہے یعنی یہ اس کی گھر پر بیوی سے ناچاقی ہوئی، یا اس کو ہیڈ ماسٹر نے ڈانٹا ہو، اس کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہیڈ ماسٹر پر تو غصہ نکال نہیں سکتا ورنہ برخاست ہو جائے گا۔ اس لئے وہاں وہ پی جاتا ہے لیکن اس کا اثر اس کے غیر شعوری ذہن میں محفوظ رہتا ہے اگر شاگردوں پر نہ نکلے گا تو گھر آکر بیوی بچوں کو مارے گا۔ اور اگر فرض کرلیا جائے کہ ماسٹر شادی شدہ نہیں تو پھر اس کی ناراضگی کی وجہ گھر کے رشتہ داروں یا باہر دوستوں میں تلاش کرنا پڑے گی۔ بیوی اگر گھر میں خاوند سے لڑتی ہے تو بچوں کو پیٹ کر غصہ نکال لیتی ہے۔ گویا یہ ایک قدرتی امر ہے کہ جوش یا جذبات منتقل ہوتے رہتے ہیں مگر اس کا بے جا تصرف جماعت کے لئے زہر قاتل ہے۔ کم از کم وہ لوگ جو سمجھ رکھتے ہیں ان کو اس کا مرتکب نہیں ہونا چاہئے۔

خاموشی کے فوائد | خاموشی کے فوائد میں کئی باب باندھے جا چکے ہیں، متعدد احادیث اس موضوع پر ملتی ہیں طوالتِ تحریر کے ڈر سے انھیں یہاں درج نہیں کیا جاتا، تاہم خاموشی کا تعلق چونکہ جذبات سے ہے، یہاں اختصاراً کچھ عرض کیا جاتا ہے۔ آپ نے جا بجا مدرسوں اور لائبریریوں میں یہ نوٹس لگا ہوا دیکھا ہوگا

Talk Less and Think More

یعنی "بات کم کرو اور سوچو زیادہ" یا "Silence is Gold" یعنی خاموشی سونا ہے ان فقرات پر ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کے اندر کس قدر حقیقتیں پنہاں ہیں جنھیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ کتب خانوں ہی میں عمل کرنے کے لئے ہیں روزمرہ زندگی سے اس کا تعلق نہیں۔ عقلمند آدمی دوسرے کی گفتگو سے اس کو بھانپ جاتا ہے۔ بعینہ اسی طرح جیسے نفس شناس چہرہ دیکھ کر انسان کے متعلق بتا دیتا ہے کہ یہ کس قسم کا انسان ہے، یا چال ڈھال دیکھ کر بتایا جا سکتا ہے کہ یہ انسان کس قسم کا ہوگا۔ یہ محض اس لئے ہے کہ انسان کی ہر حرکت کے اندر معانی پنہاں ہوتے ہیں اور ہر حرکت کا ایک مقصد اور مطلب ہوتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ کسی انسان کے پاس بھی اس قدر علم نہیں کہ ہر وقت باتیں کرتا رہے۔ علم کا حال تو یہ ہے کہ جس قدر بھی پڑھتے جاؤ دماغ خالی معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر لوگ جو باتیں کرنے کے عادی ہوتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ بیہودہ باتیں زیادہ کرتے ہیں اور کام کی بہت کم! ان باتوں میں یا تو وہ کسی کی برائی یا چغلی کرتے ہوں گے یا پھر قطعی طور پر غیبت کے مرتکب ہوتے ہوں گے۔ مذہبی نقطۂ نگاہ سے ایک مسلمان کے لئے غیبت گناہ کبیر ہے۔ اکثر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی کی غیر موجودگی میں اس کے متعلق کوئی جھوٹی بات کہی جائے تو وہی غیبت ہوگی، حالانکہ غیبت اس کو کہتے ہیں کہ کسی کی عدم موجودگی میں اس کے متعلق کوئی ایسی بات کہی جائے جسے سن کر وہ برا مانے۔ خواہ ایسی بات سچی ہی ہو۔ دنیا کے آدھے جھگڑے محض غیبت کی وجہ سے ہوتے ہیں انسان اپنی فطرت سے باز نہیں آتا۔ وہ باتیں کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کی کمزوریاں اس کے اندر Complex پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ اپنے حجابات کا اعتراف نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے اور پھر جب اس کی کمزوریوں کا علم اس کے لواحقین میں ہونا شروع ہوتا ہے تو وہ اپنی زبان کھولتا ہے تاکہ ان کی تردید کرے اس تردید میں وہ بہتوں کی برائیاں کرجاتا ہے تاکہ اپنی بھلائیوں کا ثبوت دے۔ یہ سب کچھ احساس کمتری ہی کے ماتحت ہوتا ہے۔ وہ محسوس نہیں کرتا مگر اندر ہی اندر سے جماعت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو جاتا ہے۔ والد صاحب مرحوم بچپن میں ایک نصیحت کرتے تھے کہ جو کچھ تم سنو اس پر مت اعتبار کرو اور جو کچھ تم دیکھو اس پر صرف آدھا یقین کرو۔

ہماری جماعت کا نظام اس قدر بکھر گیا ہے کہ اس کا ایک فرد بھی قابل اعتماد نظر نہیں آتا۔ کسی کی بات کا یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ اس کی محض یہی وجہ ہے کہ انسان کا عمل خیالی بن گیا ہے۔ اسے جو کرنا ہوتا ہے وہ شاعروں کی طرح بیٹھ کر اپنی خیالی دنیا میں پرواز کر لیتا ہے اور سب قصے تمام کر دیتا ہے مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو وہ بیکار ہو جاتا ہے۔ زبان کھولنے سے بھی عمل مفقود ہو جاتا ہے۔ خواہش تو زبان کھول کر پوری کرلی پھر عمل کس طرح ہو؟ ایک شخص دیکھتا ہے کہ وہ ایک کام کا اہل نہیں اور نہیں کر سکتا۔ اسے احساس ہوتا ہے اس کمزوری کا۔ مگر اس میں اس قدر اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی کمزوری کا اعتراف کر سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ناکامی کا الزام دوسروں کے سر تھوپنے لگتا ہے۔ اب اس کے نزدیک سب نکمے اور بیکار ہیں اور دنیا میں صرف وہی ایک کام کا ہے۔ یہ روزمرہ کے مشاہدات ہیں جو ہم دیکھتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پس جب کسی شخص کو کسی کی غیبت یا برائی کرتے دیکھا جائے تو فوراً بلا تامل یہ سمجھ لیجئے کہ یہ شخص احساسِ کمتری کا شکار ہے اور سوسائٹی میں رخنہ ڈالنے کے درپے ہے۔ نقص خود اس کے اندر ہے یہ محض بنتا ہے۔ جس کی برائی کرتا ہے وہ اس سے اچھا ہے۔ اگر ایک شخص واقعی برا ہے تو اس کو تو سب برا کہیں گے ایک آدھ کے کہنے سے کوئی برا نہیں بن جاتا۔ پس خاموشی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے جس کا تعلق ہمارے اس موضوع سے ہے کہ وہ غصہ کو دبا جاتی ہے اور غیبت سے روکتی ہے۔ یہ دو باتیں ایسی ہیں جو علم النفسیات کی رو سے زندگی کے افادی پہلو کے لئے بہت ضروری ہیں۔ خاموشی کے اور بہت سے فائدے ہیں لیکن ہمارے موضوع سے ان کا تعلق کم ہے لہذا ہم انھیں نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ہمارے نزدیک ایک مسلمان کے لئے ایسے حجابات اور حرکات کا مرتکب ہونا بعید از عقل ہے۔ مسلمانوں کے لئے تمام وہ ہدایات موجود ہیں جو ایک اچھی منظم سوسائٹی کے لئے ضروری ہیں، ان ہدایات سے وہ روزمرہ کی ضروریات کے لئے بہت کچھ روشنی اور نورِ یقین حاصل کر سکتا ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے لئے قرآن کریم اور احادیث میں ہدایات موجود نہ ہوں۔ لباس، طعام گفتگو، نشست و برخاست، ہمسایوں سے تعلق، والدین کا ادب، بہن بھائیوں سے تعلقات، طہارت، نکاح، طلاق اور دیگر فرائض ان سب کے متعلق اس قدر مواد موجود ہے کہ کسی بڑی سے بڑی علم النفسیات کی کتاب میں بھی یہ باتیں موجود نہ ہوں گی۔

حیرت کا مقام ہے کہ ان تمام کے ہوتے ہوئے بھی اس قوم کا شیرازہ دگرگوں ہے۔ اس کی سوسائٹی اخلاقی سطح سے گری ہوئی ہے۔ کوئی شخص اعتبار کے قابل نظر نہیں آتا۔ ہر ایک میں خود غرضی اور نفسا نفسی موجود ہے۔ سچ کا نام ناپید ہے باوجودیکہ ہمیں اپنی مذہبی کتابوں میں قدم قدم پر ایسی باتیں ملتی ہیں جنھیں وہ جدید علوم پڑھ کر بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ مگر افسوس ہے کہ اس کی نگاہ سے یہ سب کچھ اوجھل ہے وہ خود فریبی اور احساسِ کمتری میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کے حجابات بجائے گھٹنے کے روز بروز ترقی پر ہیں۔ اس میں تفکر و تدبر کا مادہ مفقود ہو چکا ہے۔ ہمارے موضوع کے مطابق وہ ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا ہے جہاں اس کی فطرت میں جمود یعنی Fixation پیدا ہو گیا ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ مرض لاعلاج سا نظر آتا ہے وہ اپنے گذشتہ تجربات پر بھی نظر دوڑا کر نہیں دیکھتا کہ وہاں ہی سے عبرت حاصل ہو۔ جذبات کے ہنگاموں میں مخمور رہے، جذبات کے بھڑکنے کو وہ مذہب تصور کرتا ہے مسلمان کے لئے ایک قسم کا تجربہ دہرایا نہیں جاتا بس ایک ہی بار کافی ہوتا ہے۔ مشہور حدیث ہے۔

لا یلدغ المومن من حجر واحد مرتین۔ ایک مومن کو ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جا سکتا۔

اس حدیث کا مطلب ہماری دانست میں یہی ہے کہ ایک مسلمان اپنے تجربہ کو ضائع نہیں کرتا۔ لیکن ہم آج کل دیکھتے ہیں کہ وہ نہ صرف ضائع کر رہا ہے بلکہ اس کے ساتھ بہت بے دردی سے کھیل رہا ہے چہ جائیکہ عبرت حاصل کرے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سب سے عجیب قسم کی ہیچ مقداری جو آج کل مسلمانوں میں نظر آتی ہے وہ سیاست کے میدان میں اس کا احساسِ کمتری ہے۔ اس حجاب کی وجہ سے نہ تو مسلمان سوچ سکتے ہیں اور نہ ہی عمل کے قابل رہے ہیں اُن کا عمل جلسوں کے اسٹیجوں پر ختم ہو جاتا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کو ایک دو اشخاص کے سپرد کر کے خود فرار ہو جاتے ہیں (Political Escape.) نہ صرف سیاسی ذمہ داری سے فرار ہے بلکہ اخلاقی فرار بھی ہے یعنی (Moral Escape.) جب ایک قوم کا تنزل انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو اس میں یہ علامات ظاہر ہونے لگتی ہے پھر اس میں نہ سیاسی برداشت (Political Toleration.) باقی رہتی ہے اور نہ ہی سیاسی شعور (Political Consciousness.) جس کو ہم سیاسی شعور سمجھتے ہیں وہ محض ایک خود فریبی ہے. Self Consciousness. سیاسی شعور ہمیشہ انفرادی شعور کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ آج کل کے مسلمانوں میں نہ تو انفرادی شعور موجود ہے اور نہ ہی ان کی خودی بیدار ہے جو تھوڑی بہت جھلک نظر پڑتی ہے وہ محض مذہبی احساس کمتری ہے۔ مسلمان مسلمان بننا چاہتا ہے، اسے احساس ہے کہ وہ اپنے مذہب سے غافل ہے گذشتہ تاریخ اور مسلمانوں کے کارنامے اس کے پیش نظر ہیں۔ انھیں یاد کر کے وہ اپنے جذبات عارضی طور پر بھڑکا لیتا اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ جاتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ سب کچھ نتائج ہیں غلامی کے۔ جب غلامی انسان کے رگ و ریشہ میں سرائیت کر جاتی ہے تو اس کے حجابات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور پھر وہ ایک قیام گاہ بنا لیتا ہے جس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس قیام کے متعلق علامہ اقبال کی ایک مشہور رباعی ہے۔

نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد   ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے   خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

مگر جب خودی پر ہی حجاب کا پردہ پڑ گیا ہو تو ضربِ کلیم کہاں سے پیدا ہو؟ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو مسلمان کا یہ جمود ایک اور قدم آگے بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ اس مرض کی علامتیں بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ ماہرین علم النفسیات اس کو Wish Fulfilment. یعنی تکمیلِ تمنا کہتے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ آرزو یا تمنا اصلی زندگی میں تو عملی جامہ نہیں پہن سکتی البتہ تخیلی دنیا میں اسے رنگا رنگ کے لباس سے ملبوس کروایا جا سکتا ہے۔ یہ شاعرانہ تخیل عملی زندگی کی موت ہے اور یہ جو رنگا رنگ کا لباس تخیل میں نظر آتا ہے تو یہ درحقیقت عملیات کا جنازہ ہے یہ مرض نہ صرف ایک قوم کی موت کی علامت ہے بلکہ کفر و الحاد کا پیش خیمہ ہے۔ جب ایمان و یقین دل سے نکل جائیں تو یہ تخیلات کی دنیا میں آوارہ گردی کرتے ہیں۔

آج مسلمان ان علامتوں کا اقرار کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ آج وہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک مضبوط جماعت کے ہمراہ ہے اور محفوظ ہے مگر بے چارہ جماعت کے مفہوم سے بھی بے بہرہ ہے۔ قوم و ملت کے نام پر وہ بھڑک اٹھتا ہے مگر نادان یہ نہیں سمجھتا کہ جسے وہ قوم و ملت کہہ کر پکارتا ہے وہ قبرستان سے لاشیں بطور نمائش نکالی ہوئی ہیں جن میں نہ تو شعور ہے اور نہ ہی حس۔ جو نہ تو سمجھتی ہیں اور نہ ہی سنتی ہیں۔ ختم اللہ علیٰ قلوبھم۔ وہ سب حجابات کی قیام گاہ میں استراحت کر رہی ہیں، انھیں کسی بڑے ہی تازیانے کی ضرورت ہے جو بڑے دھماکے سے انھیں اٹھا دے۔ مسلمان سمجھتا ہے کہ وہ نمائشِ دلاوری کر کے حریف کو پچھاڑ لے گا مگر وہ یہ نہیں جانتا کہ حریف زمانہ شناس ہے اور اس کے احساسِ کمتری کو سمجھتا ہے۔ عقل وہ کام کرتی ہے جو طاقت نہیں کر سکتی۔ ایک انسان کی عقل ہزاروں انسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو پچھاڑ سکتی ہے مگر انسان یہ بھی نہیں سمجھتا۔ بدستور اپنے احساس کمتری کے زیر اثر نقلِ جوش کا اظہار کرتا چلا جا رہا ہے مگر حریف کی عقل اسے ہر قدم اور ہر مقام پر پچھاڑ رہی ہے۔ نادان یہ سمجھتا ہے کہ جیت اسی کی ہو رہی ہے۔ اپنی جماعت کی تڑپ پر ڈھارس لگائے بیٹھا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ یہ تڑپ احساسِ کمتری کا نقلِ جوش ہے۔ تڑپ حرکت کی مقتضی ہے پھر حجاب وقیام کے کیا معنی؟ ہم جانتے ہیں کہ اس حجاب کے پیچھے ایک طوفان کی شوکت پنہاں ہے۔ مگر اسے کیا کہئے کہ یہ حجاب خود ساختہ ہے احقیقی زندگی کے لئے اس کا اظہار مقصود ہے نہ کہ حجاب اور اس کے اظہار کے لئے دل ونگاہ مسلمان چاہئیں

دل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!!

ہمارے نزدیک اس کی سب سے اہم وجہ جو نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان میں ایمان اور یقین مفقود ہو چکا ہے جب تک ایمان ویقین پیدا نہ ہوگا حجابات دور نہیں ہو سکتے افادی پہلو سے ہم اس کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلی بات جو ہمارے سامنے آتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان ویقین نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان کے دل میں ڈر یا خوف سما گیا ہے۔ یہ ایک ایسی خُو ہے جو انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ اس خوف کی وجوہات جو ماہرین نفسیات بتاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ بچپن میں خاندانی اثرات اس قسم کے ہوتے ہیں کہ بچوں کو وہ بڑوں کا دستِ نگر بنا دیتے ہیں۔ مثلاً اگر بچہ لاڈلا ہے تو اس کا ہر کام اور اس کی ہر ضرورت پوری کر دی جاتی ہے اور اسے خود زحمت کرنے کی ضرورت نہیں پیدا ہوتی اسے ہر کام کے لئے مددگار چاہئے۔ چنانچہ بڑا ہو کر بھی وہ زندگی کی جدوجہد کے لئے سہارا ڈھونڈتا ہے اور جہاں کہیں راہ ٹیڑھی آ گئی تو وہ بھاگ نکلتا ہے۔ اسی طرح دوسری وجہ جو خوف کی بیان کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ بچپن میں رات کے وقت بچوں کو ڈرانا اور ان کے ذہن پر غلط قسم کا اثر جما دینا اور بچوں کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھنا ان میں بہادری کی خُو مفقود کر دیتا ہے۔ علم النفسیات میں اس سے متعلق بہت طویل مباحث موجود ہیں۔ مگر ہمیں جس خوف کا ذکر کرنا ہے اس کی تاویل ماہرین نفسیات کے پاس موجود نہیں۔ ہم خوف یا ڈر سے صرف ایک مطلب سمجھتے ہیں اور وہ موت کا خوف ہے۔ اگر یہ خوف جزا وسزا کے لئے ہے تو ہمارے علم النفسیات میں وہ ڈر نہیں کہلائیگا۔ اور اگر موت کا ڈر اس لئے ہے کہ کوئی دنیاوی مفاد جاتا رہیگا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

توپھر وہ حقیقی خوف ہے جس کی وجوہات ہم ذیل میں بیان کرتے ہیں یعنی یہ خوف ماسوا اللہ ہے یا یوں کہئے کہ اللہ کے سوا سب سے ڈر موجود ہے اگر نہیں ہے تو اللہ سے نہیں۔ یہی خوف ہے جس کو ہم تفصیل سے عرض کرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے یعنی اس پر ایمان رکھتا ہے تو اس کے دل میں کسی اور کا رعب نہیں پڑ سکتا۔ خوف اسی شخص کو ہوتا ہے جس کا ایمان کمزور ہو، لہذا یہ ایک امر واقعی ہے کہ دنیا میں جس قدر بزدل لوگ ہیں ان سب کا ایمان کمزور ہے اور نہ ہی صرف کمزور ہے بلکہ اکثر ان میں بالکل ہی مفقود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا .... جو لوگ ایمان لائے وہ ہوں ......

وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرہ) اور ان کیلئے نہ تو کسی قسم کا خوف ہو اور نہ ہی غمگینی۔

اس قسم کی آیات مختلف جگہوں پر ہمیں قرآن کریم میں ملتی ہیں۔ ایمان کا مطلب ہی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا باقی سب کا خوف دل سے نکل جائے اور یقین کامل کے ساتھ اسی پر ہر بات کے لئے بھروسہ کیا جائے یہ خوف محض لڑائی جھگڑے کا نہیں۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ جھگڑالو انسان نہ تو بہادر ہوتا ہے اور نہ ہی اس کا ایمان پختہ ہوتا ہے بلکہ یہ تو احساس کمتری کی نشانیاں ہیں۔ بلکہ ان جھگڑوں سے بھی بلند ایک خصلت ہے جس پر پورا اترنے کے لئے انسان کو ایک بلند حوصلہ اور دل چاہیئے۔ اور اس پر عمل ایمان کی پہلی علامت ہے اور وہ راست گوئی اور اعلانِ حق ہے۔ تو گویا زندگی کے افادی پہلو کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم پہلو یہی ہوا کہ ماسوا اللہ سب کا خوف دل سے نکل جائے اس کی خلاف ورزی احساس کمتری کی موجد ہوگی۔ کیونکہ ایمان باللہ ایک فطری اور وجدانی فعل ہے کسی شخص پر بھروسہ کرنے سے بیشتر یہ یقینی بات ہے کہ پہلے خود اپنے پر بھی بھروسہ ہو جن کا بھروسہ اپنے پر نہیں ہوتا وہ شکی طبیعت کے انسان ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ بھروسے سے ہمارا مطلب مکمل اختیار نہیں ہے بلکہ ایک قابلیت کا شعور ہے جس سے انسان اپنے آپ کو تول لیتا ہے اسی لئے زندگی یا حرکت کا سب سے بڑا اصول اعتماد اور ایمان ہے۔ ہم نے زندگی کو حرکت اس لئے کہا کہ حرکت ہی زندگی کی ایک نشانی ہے اگر حرکت نہیں ہے تو موت ہے۔ اس حرکت کو جہاں انسان کا تعلق ہے ہم جدوجہد کہہ سکتے ہیں اور یہی جدوجہد ایک جہاد ہے تو گویا زندگی ایک مسلسل جہاد ہے اور جہاد بغیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایمان کے مکمل کس طرح ہو سکتا ہے۔ اور اگر جہاد میں ایمان مفقود ہے تو وہ پھر الحرب من اللہ و رسولہ ہوگا جہاد نہ ہوگا۔ بیشتر مسلمان ہمارے ان دلائل کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے، ان کے پاس گھڑے گھڑائے دلائل ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ جس میں ہیچ مقداری کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا وجود ہی اس وقت ان کے خلاف حجت ہے،

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ بلکہ انسان کا وجود ہی اس کے خلاف حجت ہے

وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ - اگرچہ وہ کتنے ہی عذر بہانے تراش لیا کرے۔

مختصراً ہمارے اس نظریے کے مطابق مسلمانوں کو دو چیزوں کی ضرورت ہے جس پر انھیں عمل کرنا چاہیے تاکہ زندگی کے افادی پہلو کو کامیاب بنایا جا سکے۔ اول یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ جو قرآنِ کریم نے کہدیا ہے وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ تو وہ اسی مسلمان کے لئے کہا گیا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا ھُمْ یَغْفِرُوْنَ یعنی جب غصہ آئے جب بھی معاف کر دیتے ہیں تو یہ بھی مسلمان ہی کی خصلت بیان کی گئی ہے۔ غصہ کو وہی دبا سکتے ہیں جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا رعب سمایا ہوا ہو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں اصولوں پر قائم رہ کر مسلمان احساسِ کمتری کے تمام حجابات پر قابو پا سکتا ہے اور وہ اس لئے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ میں اس کا ایمان مضبوط ہوگا۔ اور جب اللہ تعالیٰ میں کامل یقین ہو گیا تو پھر نتیجہ معلوم۔

وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ اور اللہ ایمان والوں کو دوست رکھتا ہے

اس کے بعد ہم زندگی کا ایک اور افادی پہلو لیتے ہیں جو نفسیاتی اعتبار سے مسلمانوں کے لئے آج کل از حد ضروری ہے اور جس کی عدم موجودگی فی زمانہ مسلمانوں کی بے بسی کا باعث ہے یہ پہلو تقدیری پہلو ہے اور اس کی جدید تاویلوں نے مسلمان کی زندگی کو مفلوج کر دیا ہے۔ مسئلہ قضا و قدر ایک پرانا دردِ سر ہے۔ ہم اس سے متعلق تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ ہم اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس کا تعلق خیر و شر کے ساتھ بالکل نہیں ہے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ خیر و شر بھی تقدیری ہے اگرچہ قضا و قدر سے مختلف مسئلہ ہے۔ خیر و شر کے متعلق ایک مستند حدیث ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لا یومن احدکم حتی یومن بالقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ
کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اس پر ایمان نہ لے آئے کہ خیروشر کی تخلیق من اللہ ہے۔

یہ حدیث ترمذی، ابن ماجہ اور مشکوٰۃ میں موجود ہے۔ ہم اسے یہاں اس لئے بیان کرتے ہیں کہ یہ ایک واقعی امر ہے اور بعینہ اسی طرح ہے جس طرح حدیث نے بیان کردیا مگر جب ہم بیان کرتے ہیں تو اس میں ایک عجیب لطیفہ پیدا ہوجاتا ہے۔ جب کبھی قضا وقدر سے متعلق دلائل پیش کئے جارہے ہوں تو عموماً یہ حدیث پیش کردی جاتی ہے حالانکہ اس کا تعلق خیروشر سے ہے نہ کہ قضا وقدر سے۔ شر سے مراد شیطینیت ہے نہ کہ ہر وہ حادثہ جو دنیاوی واقعات کی بنا پر ظاہر ہوتا ہے۔ انسانی جدوجہد کے نتائج اگر خاطر خواہ نہیں تو وہ شر نہیں کہلائیں گے اور اگر اچھے ہیں تو خیر نہیں کہلائیں گے۔ اعمال کے نتائج کا دارومدار تقدیری قانون پر ہے نہ کہ خیروشر پر خیروشر کا مفہوم انگریزی الفاظ Good and Evil. سے زیادہ بہتر واضح ہوجاتا ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ انفرادی جدوجہد کا تعلق اس کے نتائج کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے جس طرح جسم کے ساتھ روح۔ اور اگر ایک مفلوج ہو تو دوسرا بیکار ہے۔ آج کل مسلمانوں میں جدوجہد مفقود ہے وہ بغیر عمل کئے نتائج کے منتظر ہیں اور جب نتائج خاطر خواہ برآمد نہیں ہوتے وہ اسے اپنی قسمت یا تقدیر پر سونپ کر اپنی ذمہ داری اور اپنے فرائض سے فراری حاصل کرلینا چاہتے ہیں یہ علامت بھی احساسِ کمتری ہی کی ہے۔ انسان ایسے بہانے فقط اس وقت تراشتا ہے جب اسے اپنی بے بسی کا یقین اور احساس ہوتا ہے یہ محض مسلمانوں کی بے بسی ہی تھی جو انھوں نے تقدیر کے مسئلہ کو اس قدر پیچیدہ بنادیا ورنہ یہ ایک سیدھا سادھا مسئلہ تھا اور اس میں چنداں اشتباہ کا امکان نہ تھا۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ (بقرہ)
اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہو جس نے جو کمایا اس کو وہی ملتا ہے اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا۔

قرآن کریم میں مختلف مقامات پر ایک ہی موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے مگر ہر جگہ اسبابِ نزول مختلف ہیں ہم ان اسباب کو مدنظر نہیں رکھتے اور جو آیت دل کو بھاتی ہے اور حالات کے مطابق ہوتی ہے اٹھاکر اسے اپنے افعال کی تائید میں پیش کردیتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے احساسِ کمتری کا! اور سب سے خطرناک فعل ہے انسان کا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی تائید میں ہم انسان کا قول پیش نہیں کرتے۔ مگر بوجہ احساس کمتری چاہتے ہیں کہ ایسا قول پیش کیا جائے جس کا رد مشکل ہو۔ پس اپنی صفائی میں اللہ تعالیٰ کے کلام کو پیش کرتے ہیں کیونکہ عوام اس کا رد بوجہ جاہلیت بمشکل ہی کر سکتے ہیں۔ قرآن کریم کو بطور سند پیش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اول کسی ایسے مسئلے کی صفائی کر دی جائے جس میں شبہات ہوں اور کسی بات کی تصدیق کر کے حقیقت ظاہر کر دی جائے مگر آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بعض خود غرض ہستیاں دنیاوی اغراض اور ذاتی کوتاہیوں کو ترتیب دیکر سلجھانا چاہتی ہیں اس تطابق کی وجہ محض احساسِ کمتری ہے مصیبتیں اور مشکلات خیر و شر کے مسائل نہیں ہیں، ان کا تعلق قضاؤ قدر سے ہے اور ان کا انحصار انسانی جدوجہد پر ہے۔ قسمت کی آڑ لیکر ہم اپنی ذمہ داریوں سے بھاگتے ہیں۔ اس کی وجہ سے زندگی کا ایک اہم افادی پہلو مفقود ہو جاتا ہے۔ اپنے افعال کے ناموافق نتائج کے لئے ہم اسباب تلاش کرتے ہیں حالانکہ ہم خوب جان رہے ہوتے ہیں کہ وجوہات کیا ہیں۔

کُلُّ امرئٍ بما کسب رَھِینٌ ہر انسان اس کے نتیجے کے ساتھ جو اس کی کمائی ہے بندھا ہوا ہے تو پھر تلاش اسباب چہ معنی دارد؟ اسباب تو خود اس کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور اسے خود اپنے اندر تلاش کرنا چاہیئے نہ کہ دوسروں میں یا تقدیر کے لکھے ہوئے پر۔۔

وَمَا اَصَابَکُم مِّن مُّصِیبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَت اَیدِیکُم وَیَعفُوا عَن کَثِیر — اور تم کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے کئے ہوئے اعمال کا نتیجہ ہے۔

اور نتائج کے متعلق اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

وَاَن لَّیسَ لِلاِنسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ — یعنی انسان کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتا مگر جس چیز کے لئے وہ کوشش کرتا ہے۔

تو گویا ہم دیکھتے ہیں کہ فی زمانہ انسان احساسِ کمتری کا شکار ہو کر کن کن آفات میں گرفتار ہو رہا ہے نہ ہی صرف یہ بلکہ اوروں کو بھی غلط راہ روی کی تلقین کرتا ہے۔

علم النفسیات کا ایک اور افادی پہلو جو احساسِ کمتری کی وجہ سے مفقود ہوتا چلا جا رہا ہے وہ حلیمی اور انکساری ہے۔ غرور و تکبر روز بروز بروئے ترقی ہے باوجودیکہ قرآن کریم کا اعلان ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَلَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ   اور اللہ اترانے والوں کو اور بڑائی مارنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

غصہ کی طرح غرور و تکبر بھی علامات احساس کمتری ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر فرد کو دوسرے کے برابر پیدا کیا ہے تو پھر غرور و تکبر کے کیا معنی؟ دنیاوی جاہ و حشمت کی بنا پر تکبر جاہلوں کا شیوہ ہے۔ انسانیت میں مساوات تب ہی برقرار رہ سکتی ہے جب حلیمی اور انکساری موجود ہو۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ تعصب، اذعانیت، رشک، خود بینی، لنترانیاں، حرص، بدظنی اور دوسروں کے مصائب پر خوش ہونا، اختیار کر کے انسان اپنا تحفظ قائم کرنا چاہتا ہے۔ انفرادی تحفظ کا یہ مقصد نہیں کہ معاشرتی نظام کو آلودہ کیا جائے۔ بلکہ انسان کی فطرت جو کہ صالح ہے اس بات کی مقتضی ہے کہ امن قائم ہو۔ اور امن اندریں حالات کہ مندرجہ بالا خصائل جماعت میں موجود ہوں کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔ یہ خصائل غیر فطری ہیں اور احساس کمتری کا پیش خیمہ ہیں۔ اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو ان کے جذبات نے ایک احساسِ برتری پیدا کیا ہے Superiority Complex حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ احساسِ برتری اول ہیچ مقداری ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ جب تک ہیچ مقداری کا احساس موجود نہ ہو، یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ احساسِ برتری پیدا نہیں ہو سکتا۔ ہم لکھ آئے ہیں کہ افراد کو چھوڑ کر ہمیں یہ علامات اقوام میں بھی ملتی ہیں جنگ، سیاسی گالی گلوچ۔ مختلف قسم کے جرم، خودکشی وغیرہم۔ سب احساس کمتری ہی کی علامتیں ہیں۔

مختصر یہ کہ دنیاوی نظام کو بگاڑنے میں سب سے بڑا ہاتھ احساس کمتری کا ہے۔ جب تک اس علت کی بیخ کنی نہ کی جائے گی انسان انسان کے سامنے اپنے اصل رنگ میں ظاہر نہیں ہو سکتا اور ہر شخص ہر قدم پر اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہے گا۔ جب کبھی انسان اکیلا ہوتا ہے تو وہ اس وقت حقیقت کے میدان سے نکل کر تخیلی دنیا میں پرواز کرتا ہے اور یہی وہ دنیا ہے جہاں وہ حقیقت سے بہت دور نکل جاتا ہے اور آپ کو دھوکہ دینا شروع کرتا ہے۔ علم النفسیات کا سب سے اہم افادی پہلو یہی ہے کہ جماعت کو برقرار رکھا جائے۔ جماعت کے ہر فرد کو اس بات کا شعور ہونا چاہئے کہ اس کے فرائض کیا ہیں، بغض و عناد رشک و حسد، تعصب، نکتہ چینی وغیرہم یہ سب ایسے خصائل ہیں جن سے جماعت میں رخنہ پڑ جاتا ہے ہر فرد کا فرض ہے کہ ان سے پرہیز اور احتراز کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم اس بات سے بھی انکار نہیں کرتے کہ رائے زنی اور نکتہ چینی بسا اوقات مفید بھی ثابت ہو سکتی ہے مگر جہاں رائے قائم کرنا ہر شخص کا اخلاقی فرض ہے وہاں یہ بھی لازم ہے کہ رائے صرف اپنی ذات کے ساتھ وابستہ رکھی جائے جب تک کہ اس کی تصدیق نہ ہو جائے چنانچہ یہ بھی ایک اخلاقی فرض ہے کہ رائے کا اظہار نہ کیا جائے جب تک کہ اس کی تصدیق نہ ہو جائے یہ اجتماعی اصولوں کے مطابق ہے جب تک ایک رائے دوسری رائے پر پرکھ نہ لی جائے اس کا اعلان کرنا جائز نہیں ہے۔ انفرادی رائے حقیقی معنوں میں رائے نہیں ہوا کرتی وہ محض جذبات کے ماتحت احساسِ کمتری کے ذریعہ نقلِ جوش کا اظہار ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی واسطے یہ قانون قائم کر دیا ہے

وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ   اور ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے کرو

یہ مشورہ اسی واسطے پایا ہے کہ پیشتر اس کے کہ ایک رائے کا اعلان کیا جائے اس کا دوسری مستند رائے سے پرکھنا ضروری ہے وقال عمر رضی اللہ تعالیٰ لاخلافۃ الا بمشورہ یعنی خلافت بغیر مشورہ کے خلافت نہیں ہے اور پھر خلافت کیا چیز ہے آخر؟ خلافت نام ہے ایک معاشرتی نظام کا جو مسلمانوں کی جماعت قائم کرتی ہے اور سیاسیات میں اس جماعت کی رہنمائی کرتی ہے اور اگر ایسی جماعت میں بغیر مشورہ کوئی بات نہیں ہو سکتی تو پھر انسان کو کیا حق ہے کہ وہ خواہ مخواہ رائے زنی کرتا پھرے۔ قرآن کریم کا مشہور ارشاد ہے۔

وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ   ان سے مشورہ کرو اور جب کسی بات پر تمہارا عزم

فَتَوَکَّلْ عَلَی اللہِ   قائم ہو جائے تو پھر صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرو۔

کس قدر صریح اور صاف حکم ہے جسے ہم آج کل سمجھنے سے قاصر ہیں۔ آخر یہ حکم کیوں دیا گیا تھا؟ محض اس لئے تھا کہ جماعت کا نظام برقرار رہے۔ اگر مشورہ سے کام نہ ہو تو پھر ہزار ہا رائے قائم ہو جائیں گی اور کوئی کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے گا۔ نتیجہ معلوم۔

مضمون بڑھتا جا رہا ہے لیکن موضوع اس قدر وسیع اور دلچسپ ہے کہ "افسانہ از افسانہ می خیزد" کسی آئندہ صحبت میں ہم انشاء اللہ تعالیٰ اسی موضوع پر کچھ اور عرض کریں گے۔

واٰخرون اعترفوا بذنوبھم خلطوا عملاً صالحاً واٰخر سیئاً عسی اللہ ان یتوب علیھم۔ ان اللہ غفور رحیم ؕ

© rasailojaraid.com